عثمانؓ
صرف تاریخ کی روشنی میں

از

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجم

(جناب مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

(۳)

اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں سب سے پہلے یہ بات صاف کرلینی چاہیئے کہ اُس حاکمانہ نظام کی حقیقت کیا ہے جو ہجرت کے وقت سے لے کر حضرت عمرؓ کی شہادت اور حضرت عثمانؓ کی خلافت تک قائم ہوچکا تھا بعض وہ لوگ جنہیں معاملات کی ظاہری سطح مبتلائے فریب بنا سکتی ہے خیال کرتے ہیں کہ یہ حکومت یا زیادہ گہری تعبیر میں اس مختصر سے عہد کا نظام حکومت الٰہی تھا جس کی بنیاد سر سے پاؤں تک دین پر تھی اب دین کا مفہوم اس خاص ماحول میں چوں کہ آسمان سے نازل شدہ ایک حقیقت ہے اس لئے اس خیال کے حامی اس کا یقین رکھتے ہیں کہ اس عہد میں جس حکومت نے مسلمانوں کا نظم سنبھالا اس کی قوت کا مدار اور سلطانی خدا اور صرف خدا کی امداد غیبی تھی، لوگوں کا اس میں کچھ عمل دخل نہ تھا، نہ وہ اس میں شرکت کر سکتے تھے نہ اس پر معترض ہو سکتے تھے اور نہ وہ اس سے انکار کے مجاز تھے اس خیال کے لوگ محسوس کرتے ہوں گے کہ ان کے حق میں یہ ایک سچی اور کھلی ہوئی دلیل ہے کہ خود نبی کریم صلعم نے اللہ جل شانہ کے حکم سے اس حکومت کی بنیاد رکھی اسی نے آپ کو مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا اور مکہ کے مسلمانوں کو آپ کا ساتھ دینے کی ہدایت کی پھر خدا ہی نے نبی کریم صلعم پر حکومت کے مجمل اور مفصل احکام وحی کئے، سورہ نجم میں اسی کا ارشاد ہے کہ

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى

تمہارا ساتھی راہ سے بھٹکا نہیں وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا۔ وہ جو کچھ پیش کرتا ہے وحی الہی ہے۔

اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اس کی اور رسول کی فرمانبرداری کریں اس نے کھلے طور پر اعلان کر دیا کہ مسلمان ایماندار اس وقت ہو سکتے ہیں جب وہ اپنے اختلافی معاملات میں نبی کریم صلعم کو حکم بنائیں ان کے لئے اس دلیل میں اس سے بھی قوت پہنچ سکتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلعم کے خلیفہ تھے اور حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے پس مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کو حضرت نے حکم دیا اور خود حضرت نے اللہ سے حکم پایا، ان وجوہ کی بنا پر اس عہد کا نظام حکومت بالکل الہٰی نظام تھا، بلاشبہ اس خیال سے زیادہ کوئی خیال غلط نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اسلام کی حیثیت بہر حال ایک دین کی ہے جس نے اپنے ان احکام اور حدود میں جن کا تعلق سب سے پہلے خدا کی توحید اور پھر نبوت کی تصدیق اور اس کے بعد نیک اور صالح زندگی سے ہے عام انسانوں کو ان کی دنیاوی اور اُخروی فلاح کی طرف متوجہ کیا لیکن اس نے ان کی آزادی نہیں چھینی، ان کا پورا پورا مالک و مختار نہیں بنا، اور نہ ان کے ارادوں کو معطل کیا، اس نے تو مقررہ حدود میں انھیں مختار بنایا کل مستحبات اور تمام مکروہات گنائے البتہ عقل اور دل کی قوت سا تھ کر دی کہ غور و فکر کریں اور اس بات کی اجازت دی کہ بھلائی اور سچائی، رفاہِ عام اور مصالح خاص میں اپنے بس بھر حصہ لیں۔

۔۔ خدا نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کرے اگر حکم کا تعلق آسمان ہی سے ہوتا تو نبی خدا کے حکم کے مطابق ہر بات کی تکمیل بلا کسی کے مشورہ کے کر لیتا حالانکہ ارشاد خداوندی ہے

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

اور اگر تو تند خو اور سخت دل ہوتا تو متفرق ہو جاتے تیرے پاس سے سو تو ان کو معاف کر اور ان کے واسطے بخشش مانگ اور ان سے مشورہ لے کام میں

اور پھر احد کے ابتلا کے بعد اس آیت کے نزول سے قبل نبی کریم صلعم نے غزوہ بدر میں اپنے صحابہ کا مشورہ قبول کیا تھا جب آپ ان کو ایک مقام پر ٹھہرانا چاہتے تھے اور بعضوں نے دریافت کیا کہ اس مقام کا انتخاب تدبیر اور مصلحت کے ماتحت ہے یا اس کے لئے خدا کا حکم ہے تو آپ نے جواب دیا خدا کا حکم نہیں، تدبیر و مصلحت کی بنا پر ہے تو پھر آپ کو مشورہ دیا گیا کہ یہ مقام جنگی مصالح کے مناسب نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کو یہاں سے ہٹا کر پانی سے قریب کسی جگہ جمنے کا حکم دیا جائے، پھر واقعہ بدر کے بعد قیدیوں کے سلسلے میں آپ نے صحابہ کا مشورہ قبول کیا جس سے متعلق عتاب آمیز آیت نازل ہوئی اور فرمایا گیا کہ

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ	نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں قیدیوں کو رکھے جب تک خوب خوں ریزی نہ کرلے

احد کے موقع پر جب نبی کریم صلعم کو قریش کے آنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے خیال کیا کہ مدینے ہی میں قیام کریں اور باہر نکل کر ان سے مقابلہ نہ کریں ہاں اگر وہ مدینہ پر حملہ آور ہوں تو پھر مدافعت کریں لیکن صحابہ اور خصوصاً انصار نے آپ پر زور ڈالا کہ دشمن سے مقابلہ کے لئے نکلنا ضروری ہے چنانچہ آپ نے ان کی بات مان لی اور مقابلے کی تیاری فرمانے لگے مسلمانوں نے اس عرصہ میں ندامت سی محسوس کی کہ انھوں نے رسول اللہ صلعم کو ان کی مرضی کے خلاف مجبور کیا چنانچہ انھوں نے آپ کو مسلح آتے دیکھ کر معذرت کی اور اس بات کی اجازت چاہی کہ حضرت ہی کی رائے پر عمل کیا جائے لیکن آپ نے اس سے انکار کیا اور جو مشورہ منظور کر لیا تھا اسی پر اڑے رہے اگر الٰہی نظام ہوتا اور ہر کام کے لئے آسمان سے حکم کا نزول ضروری ہوتا تو مسلمان رسول اللہ صلعم کو مجبور نہیں کر سکتے تھے، اور خود رسول اللہ ان کا مشورہ قبول نہیں فرماتے، خواہ حالات کی نزاکت کا تقاضا کچھ ہی ہوتا، غزوہ احزاب کے موقع پر آپ نے صحابہ کے مشورے اور ان کی رائے پر اعتماد کر کے خندق کھودنے کا آغاز خود کیا۔

یہ اور اسی طرح بہت سے دوسرے مواقع پر نبی کریم صلعم نے صحابہ سے مشورہ کیا اور ان کی رائے پوری رضامندی کے ساتھ قبول فرمائی، حدیبیہ کا موقع تھا قریش چاہتے تھے کہ اس سال زیارت بیت الحرام کے بغیر آپ واپس ہو جائیں، قریش کی اس خواہش سے صحابہ کسی طرح متفق نہ تھے، آپ نے اس سلسلے میں جب ان سے مشورہ چاہا تو سبھوں نے مخالفت کی بعضوں نے حد درجہ اصرار کیا حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک کہہ دیا

لم نعطی الدنیۃ فی دیننا — اپنے مذہب کے معاملہ میں ہم اتنا نیچے کیوں اتریں

اب تو چہرۂ انور پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے اور فرمایا میں اللہ کا رسول اور اس کا بندہ ہوں مسلمانوں نے محسوس کیا کہ معاملہ مشورہ اور گفت و شنید کا نہیں شاید آسمان سے وحی نازل ہو چکی ہے چنانچہ سبھوں نے خدا سے توبہ اور نبی سے معذرت کی اور اللہ نے انا فتحنا لک فتحا مبینا آخری آیت تک نازل کی،

اگر ہم ان تمام مواقع کی تفصیل پر متوجہ ہوں تو بات ہماری ضرورت سے بہت زیادہ لمبی ہو جائے گی، پھر جو تھوڑے سے واقعات پیش کئے گئے وہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ عہد نبوی میں احکام کا نزول پوری تفصیل کے ساتھ نہیں ہوتا تھا، وحیِ خداوندی آتی تھی اور رسول اور اصحابِ رسول کو عام اور خاص مصالح کی طرف متوجہ کر دیتی تھی بلا اس کے کہ ان کی اس آزادی کی راہ میں حائل ہو جو انہیں حق دیتی ہے کہ سچائی، بھلائی اور انصاف کے حدود کے اندر اپنے معاملات کے لئے اپنی مرضی کے مطابق تدبیریں کریں اور شاید ہمارے اس خیال کی سب سے زیادہ قطعی اور سچی دلیل یہ ہو گی کہ قرآن کریم نے سیاسی امور کی مجمل یا مفصل کوئی تنظیم نہیں پیش کی اس نے صرف "عدل" "احسان" اور رشتہ داروں کی خبر گیری کرنے "فحشاء" "منکر" اور "بغی" سے بچنے کی تاکید کی، اور اس کے لئے عام حدود مقرر کر دیئے، اور پھر مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ ان حدود کے اندر رہ کر اپنی مرضی کے مطابق انتظامات کریں، خود نبی کریم .... اپنی سنت میں حکومت یا سیاست کے لئے کسی مقررہ نظم کا نقشہ نہیں بنا گئے بیماری شدید ہو جانے پر بھی آپ نے مسلمانوں کے لئے

اپنے صحابہ میں سے کسی کو اپنا خلیفہ کسی دستاویز کے ذریعے مقرر نہیں فرمایا ہاں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا، پھر مسلمانوں نے خیال کیا کہ صدیق اکبر کو رسول اللہ صلعم نے ہمارے دین کے لئے پسند فرمایا تو کیا مضائقہ ہے کہ ہم انہیں اپنی دنیا کے لئے بھی پسند کرلیں؟ اگر مسلمانوں کے لئے کوئی سیاسی آسمانی نظام ہوتا تو یقیناً قرآن مجید میں اس کی شکل بنائی جاتی اور بلاشبہ نبی کریم صلعم اس کے حدود اور اصول بیان فرماتے اور بلا کسی بحث وحجت کے مسلمانوں کے لئے اس پر ایمان لانا فرض کیا جاتا۔

پھر دوسری ایک بات جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا نظام عہد نبوی میں اور آپ کے دونوں خلفا کے زمانے میں آسمانی نہ تھا بیعت کا سلسلہ ہے جس کا اجرا خود نبی کریم نے اپنے عہد سے کیا، سب لوگ جانتے ہیں کہ بدر کے موقع پر صحابہ کو نبی کریم صلعم نے کھلے طور حکم نہیں دیا تھا ہاں آپ نے تحریک کی تھی اور رغبت دلائی تھی اور اللہ کی طرف سے دو میں سے ایک نیکی کا وعدہ کیا تھا، اور انصار سے اس بات پر معاملہ طے ہوا تھا کہ آپ ان کو جہاد میں نہیں لے جائیں گے ہاں اگر آپ پر کوئی افتاد آپڑے تو وہ مدافعت میں حصہ لیں گے ان حالات میں جب غزوۂ بدر کا موقع آیا تو آپ نے صحابہ سے مشورہ لیا اور منتظر رہے کہ صحابہ اپنے خیالات پیش کریں گے، بہر حال میدان جنگ میں آپ ان لوگوں کو لے کر اس وقت تک نہیں گئے جب تک انصار کی سرداروں نے یہ نہیں کہہ دیا "اگر آپ اس دریا میں بھی ہمیں لے چلتے تو ہم یقیناً آپ کے ساتھ ہوتے" اس طرح آپ پر واضح ہوگیا کہ وہ جہاد کے لئے راضی تھے، لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ نے صحابہ کو قریش سے لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا جب حدیبیہ کے دن آپ کو معلوم ہوگیا کہ قریش نے حضرت عثمان کے ساتھ دغابازی کی، بلکہ آپ نے متوجہ کیا تھا جس پر لوگوں نے جان تک کی بازی لگادینے کی بیعت کی اس وقت اگر کوئی بیعت نہیں کرتا تو اس کے لئے گنجائش تھی لیکن بلا استثنا سبھوں نے بیعت کی کیونکہ وہ رسول پر اور رسول بھیجنے والے خدا پر ایمان رکھتے تھے اور اس کی پکار کا جواب دینے کے لئے تیار تھے اسی بیعت کے متعلق سورۂ فتح میں خدا نے آیت نازل فرمائی

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ	کہ جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں ان کے ہاتھ پر خدا کا ہاتھ ہے،

اور پھر قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ہیں جن میں مسلمانوں کو جہاد کے لئے دعوت اور رغبت دلائی گئی ہے ان میں ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جو اس فرض کی ادائیگی میں بچھڑ گئے اور خدا اور اس کے رسول نے انہیں معذور سمجھا اور ان لوگوں کا بھی جن کا عذر نہیں سنا گیا لیکن ان میں کسی کو نبی نے خود کوئی سزا نہیں دی بلکہ معاملہ خدا پر چھوڑ دیا چاہے معاف کرے چاہے سزا دے۔

پھر یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ خلافت کی بنیاد بیعت پر قائم ہے یعنی عوام کی مرضی پر، اس کے معنی یہ ہیں کہ خلافت حاکم اور محکوم کے درمیان ایک معاہدہ ہے جو ایک طرف خلفا کو اس بات کا ذمہ دار بناتا ہے کہ وہ مسلمانوں پر حق اور انصاف کی حکومت کریں گے ان کے مصالح کی رعایت رکھیں گے اور ان کے معاملات میں بس بھر رسول اللہ صلعم کی سیرت پر عمل کریں گے اور دوسری طرف مسلمانوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ خلیفہ کی اطاعت کریں اور اس کے لئے نصیحت اور نصرت کا باعث ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے کسی خلیفہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی سلطانی اور حکمرانی اپنی طرف سے فرض کر دے تاآنکہ وہ مسلمانوں سے قول و قرار نہ کرے اور ان سے عہد نہ لے اور اس طرح ایک مشترک معاہدے کی روشنی میں حکومت کرے یہی وجہ ہے کہ اقتدار اور سلطانی نبی کریم کی وراثت میں دخیل نہیں ہو سکی، اور آپ نے اہل بیت کو اس کا وارث نہیں بنایا، اور خود ابو بکر کو بھی یہ منصب جماعت کی سپردگی، بیعت اور اعتماد کے بغیر نہیں ملا، پھر ابو بکر نے اپنی اولاد کو اور عمر بن خطاب نے اپنے بیٹوں کو وارث نہیں بنایا حضرت عمر کی خلافت عام مسلمانوں کے مشورے کی بنیاد پر ہے اس لئے کہ جب تک صدیق اکبر کی رائے کو ایک قابل قبول مشورہ جان کر عوام نے اپنی رضامندی اور بیعت کا اعلان نہیں کر دیا حضرت عمر خلیفہ نہیں بن سکے، اور اس لئے کہ حضرت عثمان، صدیق

اکبر کی رحلت سے پہلے ان کا مہر کردہ لفافہ لے کر مسلمانوں تک پہنچے اور ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ اس لفافے میں لکھے ہوئے شخص کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، لوگوں نے جواب دیا ہاں، کیونکہ ان کو حضرت ابو بکرؓ پر اعتماد تھا اور وہ آپ کو اپنا سچا خیر خواہ اور مخلص درد مند یقین کرتے تھے حضرت عمرؓ کا کوئی لڑکا خلافت کا وارث نہیں ہو سکا، آپ نے ہرگز گوارا نہیں کیا کہ آپ کے بعد آپ کا کوئی لڑکا خلیفہ ہو ہاں آپ نے اپنے بیٹے عبد اللہ کو مجلس شوریٰ میں شرکت کی اجازت ضرور دی لیکن اس شرط پر کہ وہ بحث میں کوئی حصہ نہ لیں اور یہی وجہ تھی کہ معاویہ کے عہد میں جب اقتدار میں وراثت کا پیوند لگ گیا تو عام مسلمانوں نے اپنی بے زاری کا اظہار کیا اور کہنے والوں نے کہہ دیا کہ "معاویہ خلافت کو ہرقل اور کسریٰ کی چیز بنا رہے ہیں" پس ان تمام باتوں سے اگر کچھ نتیجہ نکلتا ہے تو وہ یہی کہ عہد نبوی میں جو نظام حکومت تھا وہ کوئی الہٰی نظام نہ تھا جس میں لوگوں کی رائے اور مشورے کو کچھ دخل نہ ہو، پھر جب عہد نبوی میں یہ بات نہ تھی جب کہ وحی کا سلسلہ جاری تھا تو پھر اس سلسلے کے ٹوٹ جانے کے بعد صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے دور میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ اس نظام کو الہٰی نظام تصور کرتے ہیں وہ حقیقت میں ان الفاظ اور کلمات سے دھوکا کھاتے ہیں جو وہ خلفاء کے خطبات میں پڑھتے ہیں نیز ان روایات سے جو خلفاء کے بارے میں عام طور پر مشہور ہیں اور جن میں اللہ کا ذکر، اللہ کا حکم اور اس کی سلطانی اور اطاعت کا تذکرہ ہے یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ الفاظ اور یہ روایات اس امر کا ثبوت ہیں کہ نظام حکومت آسمانی تھا حالانکہ ان میں صرف ایک بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بالکل عام لیکن ساتھ ہی بڑی اہم ہے اور وہ یہ کہ خلافت خلفاء اور عام مسلمانوں کے مابین ایک معاہدہ ہے اور اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ معاہدہ کر لیں تو اس کو پورا کریں خواہ اس معاہدے کا تعلق حکومت کے معاملات سے ہو یا خارجی تعلقات سے یا چند اشخاص کے درمیان کسی عہد و پیمان سے، بہر حال اللہ قول و قرار کی پاسداری کا حکم دیتا ہے اور وہ انسانوں کے دلوں کا شاہد ہے کہ وہ وفا

کرتے ہیں یا غداری، وہ وفاداری پر ثواب اور غداری پر شدید عذاب دے گا۔

پس اس نقطۂ نظر سے اسلام اور مسیحیت میں کوئی فرق نہیں ہے، اسلام بھلائی پھیلانا اور برائی روکنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ عوام کی زندگی عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم اور ہر قسم کی زیادتی سے خالی ہو، اسلام ان حدود کے قیام کے بعد عوام کو آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنے معاملات کی تنظیم اپنی مرضی کے مطابق کریں، مسیحیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی، حضرت مسیح نے کسی موقع پر بنی اسرائیل کے بعض معترضین سے کہا "قیصر کا حق قیصر کو اور اللہ کا حق اللہ کو دو" میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ کا منشا اس سے یہ ہرگز نہیں تھا کہ قیصر کا حق انصاف اور صداقت کو پامال کر کے دیا جائے، یا یہ کہ قیصر اور عوام کے تعلقات کی بنیاد ظلم اور خوف پر رکھی جائے۔

اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ آپ پڑھیں گے کہ عہد عثمانی میں کچھ مسلمانوں نے حضرت عثمان کے بعض گورنروں سے اس بات پر اتفاق نہیں کیا کہ خراج اور ٹیکسوں کی یہ رقم جو جمع کی جاتی ہے اللہ کا مال ہے وہ کہتے تھے کہ یہ مسلمانوں کا مال ہے، اور اس سلسلہ میں انہوں نے کچھ مصیبتیں بھی اٹھائیں، اگر مسلمان اس زمانے کے نظام کو نظام الٰہی تسلیم کرتے تو ان کو مال اللہ کہنے سے ہرگز انکار نہ ہوتا۔ حضرت معاویہ نے جب ان کے سامنے یہ تعبیر پیش کی گئی اس طرح بات بنا دی کہ "لوگ اور ان کے پاس جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اس لئے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں پس ان کا مال اللہ کا مال ہے"

خلاصۂ کلام یہ کہ عہد نبوی کا نظامِ حکومت مقدس الٰہی نظام نہ تھا بلکہ اس کی حیثیت انسانی معاملات کی سی تھی جس میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان تھا اور جس میں لوگوں کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ اس کو جانچیں دیکھیں پھر اپنی رضامندی یا ناپسندیدگی کا اظہار کریں،

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نبی کریم صلعم اور شیخین کا دور، جمہوریت کا دور تھا لیکن یہ الفاظ کو ان کے مقررہ حدود و معانی سے آگے بڑھا دینا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جمہوری یا غیر جمہوری ہونے کا حکم لگانے سے پہلے پوری باریکی کے ساتھ خود جمہوریت کا مفہوم مقرر کرلیں، جمہوریت۔ یعنی وہ حکومت جسے عوام نے عوام کے لئے بنائی ہو، جس کے حاکم کا انتخاب عوام نے اپنے آزاد اختیار

سے کیا ہو اور جس میں حاکم کے آزاد احتساب اور نگرانی کا حق عوام کو حاصل ہو، تاکہ وہ معلوم کرسکیں کہ ان کا حاکم جمہور کی مصلحتوں کے لئے کام کر رہا ہے یا ذاتی مصلحت کا پابند ہے پھر یہ کہ وہ اگر مطمئن نہ ہوں تو اسے معزول کرسکیں۔

یونانی عہدِ قدیم میں جمہوریت کا یہی مطلب سمجھتے تھے اور آج عہدِ جدید میں بھی جن قوموں نے اپنا نظام جمہوری بنایا ہے اس کا یہی مطلب بتاتے ہیں ہاں لفظ عوام کے مفہوم میں اختلاف رہا ہے، اس لفظ کے مفہوم کا دائرہ یونانیوں کے عہد میں تنگ تھا، اس سے ہم وطنوں کی ایک مختصر سی جماعت مراد لیتے تھے جس کے افراد تمام حقوق کے مالک ہوتے اور قانون کی نگاہ میں باہم مساوی درجہ رکھتے تھے لیکن عام انسانوں کا نہ اس مساوات میں کچھ حصہ تھا اور نہ حکومت میں، فرانس کی بغاوت کے بعد اس لفظ کے مفہوم میں کچھ اور وسعت پیدا ہوئی اور اب اس کے دائرے میں اہلِ وطن کی ایک بہت بڑی تعداد داخل ہوگئی جسے سیاسی حقوق سے استفادے کا حق دیا گیا، لیکن یہ وسعت بھی تمام اہلِ وطن کو اپنے اندر شامل نہ کرسکی اس لئے کہ عوام کے مفہوم میں اب تک اس قید کی تنگی تھی کہ وہ یا تو ایک مقررہ معیار کے دولت مند ہوں، یا ٹکس کی ایک مقررہ مقدار ادا کرتے ہوں یا تعلیم وتہذیب کے کسی خاص درجے کے حامل ہوں گذشتہ صدی کے اواخر میں اس وسعت کا دامن کچھ اور پھیلا اور وطن کے تمام بالغ مرد عوام میں شامل کرلئے گئے پھر اس موجودہ صدی میں بات یہاں تک بڑھی کہ تمام بالغ عورتیں بھی جمہور کا جزو تسلیم کرلی گئیں، بہر حال جمہوریت خواہ تنگ ہو خواہ کشادہ اپنا ایک مقررہ نظام رکھتی ہے وہ نظام جمہور کو حقوق کا مالک بناتا ہے اور اس کو اختیار دیتا ہے کہ اپنے حکام پر جانچ اور احتساب کی نظر رکھے۔

اگر ہم جمہوریت کے اسی مفہوم کو پوری دقتِ نظر کے ساتھ سامنے رکھیں تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں حکومت کا نظام جمہوری نہ تھا، اس لئے کہ حکام کا انتخاب اس باریکی سے جمہور نے نہیں کیا تھا، نبی کو عوام نے اللہ کے احکام کی تبلیغ کرنے اور حق وانصاف قائم کرنے کے لئے پسند نہیں کیا بلکہ خود اللہ نے اپنا رسول بنا کر بھیجا پھر جس کا جی چاہا ایمان لایا جس کا جی چاہا مخالفت کرتا رہا

اب اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم صلعم پر ایمان لانے والے صحابہ نے آپ کو اپنا حاکم پسند کیا، تو کہا جائے گا کہ یہ پسندیدگی جمہوریت کے نظام کے مطابق نہ تھی، اور نہ یہ پسند کرنے والے اپنے حاکم پر احتساب اور نگرانی رکھتے تھے، وہاں تو حالت یہ تھی کہ خود نبی جب ان سے مشورہ چاہتے تو اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور یہ مشورہ بھی بہت مختصر کبھی کبھی، پھر وہ بھی قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی حکومت کو بھی پورے معنی میں جمہوری نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ تمام مسلمانوں نے ان کو خلافت کے لئے منتخب نہیں کیا تھا انصار و مہاجرین کے ارباب حل وعقد کی ایک جماعت نے اپنے ابتدائی اختلاف کے باوجود ان دونوں حضرات کو پسند کیا، پھر ان عربوں سے تو مشورہ ہی نہیں لیا گیا جو مکہ، طائف اور قرب وجوار کے دیہاتوں میں آباد تھے، اور حضور کی وفات کے وقت مسلمان تھے، مدینہ والوں نے صدیق اکبر اور فاروق اعظم کو پسند کیا، باقی تمام مسلمانوں نے یہ بات سنی اور تسلیم کرلیا، ایسی حالت میں مرتدین میں سے بعض کا یہ کہنا محل تعجب نہیں

اطعنا رسول اللہ ما کان بیننا فیا لعباد اللہ ما لابی بکر

رسول اللہ جب تک ہم میں تھے ہم نے ان کی اطاعت کی، اللہ کے بندو رسول کے بعد یہ ابوبکر کون ہوتے ہیں؟

پھر عوام بلکہ انصار و مہاجرین کی یہ جماعت کوئی ایسا مقررہ نظام نہیں رکھتی تھی جس سے خلفا کی کارروائیوں پر احتساب کیا جا سکے اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر باز پرس ہو سکے، صورت حال یہ تھی کہ خلفا اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کرتے اور یہ ساتھی کبھی انفرادی حیثیت سے، کبھی اجتماعی طور پر اپنے خیالات پیش کر دیتے اور خلفا اسے منظور یا مسترد کر دیتے، بس اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے صدر اول کا نظام حکومت ان حدود کے اندر جو جمہوری دستور نے مقرر کی ہیں جمہوری نہ تھا، نہ قدیم نقطۂ نظر سے اور نہ موجودہ تخیل کے ماتحت،

اب اگر جمہوریت کا مطلب وہ عام مفہوم لیا جائے جس میں یہ بات شامل ہے کہ حاکم کو عوام کا پسندیدہ اور معتمد ہونا ضروری ہے نیز یہ کہ وہ عدل و مساوات کے اعتبار سے ایسے کردار

کا مالک اور ایسی سیرت کا حامل ہو جس میں اونچ نیچ اور ظلم و زیادتی کے لئے کوئی جگہ نہ ہو تو بلا شک کہا جاسکتا ہے کہ اس عام معنی میں جو حد بندیوں اور معیاروں سے خالی ہے اسلام کا دورِ اول جمہوریت کا دور تھا جس کے نتائج آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے لئے عہد عثمانی میں کیسے کیسے فتنے پیش آئے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور کا نظامِ حکومت ایک انفرادی شاہی عادلانہ نظام تھا جس میں صحابہ نبی کے یا شیخین کے شریکِ حکومت نہ تھے بلکہ ان کی حیثیت مشیروں کی تھی اور یہ مشیر بھی لازمی اور ضروری نہ تھے، نبی اور ان کے دونوں خلفا عدل کا حد درجہ خیال رکھتے تھے اس کے سوا کوئی اور بات ان کی نگاہ میں اہم نہ تھی، اس قسم کا تخیل مسلمانوں کے نظام کو اس طرزِ حکومت سے قریب کر دیتا ہے جو رومیوں میں شاہی اور قیصری دور میں رائج تھا، روم کے بادشاہ بھی بطور وارث، حکومت کے قطعی حق دار نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا انتخاب ہوتا تھا، اور جب کوئی ایک مرتبہ منتخب ہو جاتا پھر عمر بھر وہ حکومت کرتا البتہ شدید بغاوت اور عام نافرمانی کی حالت میں اسے معزول ہونا پڑتا، عہد نبوی اور عہد شیخین کے اسلامی نظام اور اس رومی نظام میں اگر کچھ فرق ہے تو وہ یہ کہ مسلمانوں کی حکومت کا قوام عدل و انصاف تھا، اور رومی بادشاہوں اور قیصروں کا دربار اس سے یکسر و بیشتر خالی تھا لیکن یہ خیال بھی پہلی دو رایوں کی طرح کچھ بڑی گہرائی اور دقّتِ نظر پر مبنی نہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ رومیوں کے ہاں بادشاہوں کے انتخابات میں مذہب ایک زبردست طاقت تھی جو خود ان بادشاہوں کی سیرتوں پر بھی اثر انداز تھی، پس رومی اور اسلامی نظاموں میں مذہب، مذہب کا فرق ہے جس طرح قومیت اور ماحول کا فرق ہے وہ مذہب جو رومی بادشاہوں پر غالب تھا اپنے اندر پاکیزگی اور رفعت کی کوئی ایسی شان نہیں رکھتا تھا جو اس کو آسمانی مذاہب سے کم یا زیادہ مشابہ بنا دے اس کی بنیاد تو بدشگونی اور نیک فالی پر تھی آج جب ہم پڑھتے ہیں کہ اس مذہب کی روشنی میں کس طرح غیب کی باتیں معلوم کرنے کی ترکیبیں کی

جاتی تھیں تو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے

وہ ارتقا جس نے رومی عوام کو ان کی ابتدائی اور سادہ زندگی سے نکال کر ایک پُر تکلف اور پیچیدہ حیات سے آشنا کیا اس ارتقار سے کوئی نسبت نہیں رکھتا جس نے عربوں کو ان کے دورِ جاہلیت سے کھینچ کر اسلام تک پہنچایا، رومی انقلاب ایک مادی انقلاب تھا اگر یہ تعبیر درست سمجھی جائے جو تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ تدریجی طور پر ظہور پذیر ہوا۔ اور عربی انقلاب ایک معنوی انقلاب تھا جس کی بنیاد طبیعتوں کی تبدیلی تھی جو عربوں میں اسلام کی تاثیر سے ہوئی پس کہنا چاہیئے کہ عربی انقلاب اندر سے باہر آیا طبیعتیں بدلیں اور عربوں نے اپنی زندگی کا مادی نقشہ بدلا ہوا پایا، اور رومی انقلاب باہر سے اندر آیا خارجی حالات نے پلٹا کھایا اور رومیوں کے دل اور طبیعتیں بدل گئیں،

پھر رومی اور عربی ماحول جدا جدا ہیں، اتنے جدا جتنا اٹلی سے حجاز، تو کیا تعجب کہ اسلام کے صدر اول کا نظامِ حکومت رومیوں کے شاہی دور کے نظامِ حکومت سے بالکل جدا ہو۔ میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ رمیوں کا وہ نظام حکومت جو ان کے جمہوری دور سے متعلق ہے وفات نبوی کے بعد والے نظام حکومت سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتا ہے، اس دور میں رومی اپنے قنصل کا انتخاب تقریباً اسی طرح کرتے تھے جیسے مسلمان خلفا کا، اور مہاجرین سے انصار کا یہ کہنا

منا امیر ومنکم امیر ایک امیر تمہارا اور ایک امیر ہمارا

اسی طرزِ فکر کی ایک آواز ہے۔

رومی قنصل منتخب ہو جانے کے بعد اسلامی خلفا کی طرح موثر اور شاندار حیثیت کے مالک ہو جاتے تھے لیکن ان میں اور خلفاء میں یہ فرق ہے کہ قنصل صرف ایک سال کے لئے منتخب ہوتا تھا، اور خلیفہ زندگی بھر کے لئے، قنصل کا اقتدار ان احکام اور قوانین کا پابند تھا جو مجلسِ شیوخ اور مجلسِ عوام کی طرف سے صادر کئے جاتے، اور خلیفہ کی حکم رانی پابند تھی دین کے

مقررہ حدود کی، یا جلیل القدر صحابہ میں سے کسی ایک کے مسلک کی یا عامۃ المسلمین کے مصالح کی، لیکن عرب اور اٹلی میں مشابہت کی یہ تمام باتیں بناوٹی معلوم ہوتی ہیں اور اگر ہم ان باتوں میں قیصر کی حکومت کے تکلفات اور تزک و احتشام کی داستان بھی جوڑ دیں جس کا خلیفہ کے ماحول میں کہیں پتہ بھی نہیں یا بعض ان اقدامات کا تذکرہ کر دیں جو رومی جمہوریت نے عوام کی حمایت میں، قیصر کے اقتدار پر کنٹرول کرنے کے لئے حالات سے مجبور ہو کر کئے تو مطلع بالکل صاف ہو جاتا ہے اور نظر آنے لگتا ہے کہ عربی نظامِ حکومت کے اس مختصر عہد کا رومی نظام سے دور نزدیک کا کوئی رشتہ نہیں، چاہے شاہی دور کا نظام ہو چاہے جمہوریت کے دور کا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے سیاسی امور میں، انتظامی معاملات میں اور جنگی فنون میں قیصری اور کسروی نظاموں سے بہت کچھ لیا، لیکن جس زمانے سے متعلق ہم یہ بحث کر رہے ہیں یہ اقتباس اس کے بہت بعد کا ہے، اس لئے ہمیں یہ مشابہت والی بات یہیں ختم کر دینی چاہیئے اس لئے کہ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے،

بہر حال اس وقت کا اسلامی نظامِ حکومت نہ استبدادی تھا نہ یونانیوں کا بنا ہوا جمہوری اور نہ رومیوں کا سا شاہی، جمہوری یا مشروط اور مقید قیصری، بلکہ وہ تو ایک خالص عربی نظام تھا جس کے خانے اسلام نے بنائے اور مسلمانوں نے ان کے پُر کرنے کی کوشش کی،

میں نے اپنی بعض تحریروں میں عربی نثر کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ قرآن نہ شعر ہے نہ نثر، حقایق کی تعبیر میں، مسائل کی تصویر میں اور احکام کے بیان میں اس کے خاص خاص اسلوب ہیں اور مخصوص طرز ادا، اس میں موسیقی کی بعض خصوصیتیں پا کر سادہ طبیعتوں نے خیال کر لیا کہ قرآن شعر ہے، قوافی کی پابندی دیکھ کر خیال کیا گیا وہ کلام مقفیٰ ہے، بعض دوسرے سادگی پسندوں نے اس کی سلاست اور روانی اور قیود و شرائط کی عدم پابندی دیکھ کر نثر کا حکم لگا دیا، قریش کے مشرکین کو یہیں دھوکہ ہوا اور انہوں نے قرآن کو شعر کہہ دیا جس کی سخت تردید کی گئی، اسی طرح بعض ان محققین نے دھوکا کھایا جو عربی نثر کی تاریخ تلاش کر رہے تھے اور کہہ دیا کہ قرآن سب

سے پہلی عربی نثر ہے، واقعات اس قول کی شدید ترین تکذیب کرتے ہیں اگر عربی کے نثر نگار قرآن جیسی عبارت لکھنے کی کوشش کرتے (اور بعضوں نے کی بھی) تو یہ عمل مذاق اور مضحکہ کی حد سے آگے نہ بڑھتا۔

یہ بات میں نے قرآن کے بارے میں کہی تھی، اس وقت اسی قسم کی ایک اور بات ابتدائی عربی اسلامی نظامِ حکومت کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں کہ وہ کوئی ملوکی نظام نہ تھا نبی اور نبی کے دونوں خلفا کے لئے اس سے زیادہ تکلیف پہنچانے والی کوئی اور بات نہ تھی کہ ان کو بادشاہ کہا جائے۔ اور نہ جمہوری نظام تھا اس لئے کہ جمہوری نظاموں میں ایسا کوئی پہلو نہیں ہے جو منتخب صدر کو زندگی بھر کے لئے حوالے کر دے، اور نہ رومی نقطۂ نظر کا قیصری نظام تھا اس لئے کہ خلیفہ کا انتخاب فوجی حلقے نہیں کرتے تھے پس وہ خالص عربی نظام تھا جس کی نظیر عربوں کے پاس نہ تھی پھر وہ اس کی تقلید بھی نہ کر سکے لیکن اس کے باوجود ہمارے لئے گنجائش ہے کہ ہم اس کی تحلیل کریں، اس کی باریکیوں کی چھان بین کر کے اس کا پتہ چلائیں کہ کیا اس نظام میں برقرار رہنے کی طاقت تھی یا وہ اپنی تخلیق اور ترقی سے محیط حالات کے بدلتے ہی اپنی جگہ سے ہٹ جانے والا تھا۔

اس نظام کے اجزا میں وہ جز جس میں ہماری نظر سب سے پہلے جاتی ہے مذہبی عنصر ہے اس لئے کہ آسمانی نہ ہونے کے باوجود یہ نظام آسمان یعنی دین سے بہت زیادہ متاثر ہے اور خلیفہ کے احکام ہر چند کہ وحی والہام نہیں تھے لیکن وہ بہر حال حدود اللہ کے تابع تھے یعنی حق وانصاف کا قیام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر،

وحیِ الٰہی کا یہ سلسلہ جو پورے تیئیس سال جاری رہا اور صبح وشام کبھی آیاتِ قرآنی کی شکل میں، کبھی نبی کی زبان سے حدیث بن کر، اور کبھی سیرتِ نبوی میں عملی زندگی ہو کر، مسلمانوں سے متصل رہا، اس نے خاصانِ نبی کی طبیعتوں کو جگا دیا ان کے سینوں میں ایک زندہ قوی اور دین آشنا دل روشن کر دیا پھر غیر ممکن ہو گیا کہ مسلمان اپنے قول، اپنے

عمل، اپنے فکر بلکہ اپنے سونے اور جاگنے میں بھی دل زندہ کی زد سے بچ سکے۔

چنانچہ وہ جس حال میں بھی رہا، حاکم رہا تو رعایا کے ساتھ تعلقات میں، رعیت رہا تو حاکم سے ربط ضبط میں نیز ساتھیوں سے میل جول اور روزمرہ کی زندگی میں، اپنے زندہ اور ایمان دار دل کی روشنی سے الگ نہیں رہا۔ یہی نقشہ دیکھ کر اکثر لوگ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اس عہد کا نظام ایک الٰہی نظام ہے جو آسمان سے اترا ہے، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، اصل بات خلیفہ اور اس کی رعایا کے دلوں کا دین سے متاثر ہونا ہے،

اس نظام کا دوسرا جزو وہ نسبتی شرف اور بزرگی ہے جس کی بنیاد نہ نسل پر ہے نہ دولت پر اور نہ سماج میں کسی بڑے درجے اور منصب پر بلکہ اس کی بنیاد ان تمام باتوں سے زیادہ اہم ایک حقیقت پر ہے اور وہ نبی کی زندگی میں اس کا نبی سے تعلق، ارشاداتِ نبوی پر اس کا درجۂ یقین، اور بحالاتِ امن و جنگ اللہ کی راہ میں مصائب اور مشقتوں کا برداشت کرنا۔

ان اوصاف نے اسلام کے آغاز ہی میں ممتاز افراد کا ایک طبقہ پیدا کر دیا تھا جس نے عام مسلمانوں سے امتیازی درجہ میں اپنے لئے کسی دنیاوی حق کی خواہش نہیں کی اور نہ اپنی ذات کے لئے کوئی فوری یا متوقع منفعت چاہی، رسول نے ان کو اپنی محبت سے نوازا اور عوام کو مطلع کیا کہ خدا بھی اس طبقہ سے محبت رکھتا ہے، وہ لوگ جنھوں نے اسلام لانے میں سبقت دکھائی جو اللہ کی راہ میں مصیبتیں اور عذاب برداشت کرتے رہے، وہ جو اپنا دین اپنے ساتھ لئے حبش اور پھر مدینہ ہجرت کر گئے، وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے دھن دولت اور اپنی جانیں نثار کر دیں وہ جو پروانے کی طرح شمع نبوت کا ماحول چھوڑتے ہی نہ تھے، جو کچھ کہا جاتا سنتے، جو کچھ بیان ہوتا قلمبند کرتے یہی لوگ ہیں جن سے اس طبقہ کی تشکیل ہوئی جو خدا اور اس کے رسول کو محبوب اور عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں محترم اور مکرم تھا، اس طبقہ کی کیفیت یہ تھی وہ اپنے کو دوسروں سے ممتاز اور برتر خیال نہیں کرتا تھا وہ اپنا درجہ عام انسانوں کے درجے کے برابر جانتا تھا یہی انکسار اور

فروتنی اللہ کے نزدیک ان کے درجات کی بلندی کا باعث تھی، عوام کی نگاہوں میں بھی ایسی تواضع سے ان کی عظمت اور منزلت بڑھتی جاتی تھی، یہ طبقہ بڑے بڑے نامی گرامی خاندان والوں پر مشتمل نہ تھا نہ اس کے افراد غیر معمولی دولت مند اور لکھ پتی تھے، اِدھر اُدھر کے معمولی لوگ، جن میں وہ غلام بھی تھا جو اپنے مذہب ہی کی سزا میں عذاب دیا جا رہا تھا پھر بعض مسلمانوں نے خرید کر اس کو آزاد کر دیا ان میں وہ کمزور اور بے سرو سامان بھی تھا جو پناہ کی تلاش میں مکہ آیا اور زندگی کے دن قریش کے قبیلے یا سردار کی حمایت میں بسر کرنا چاہتا تھا، ان میں بعض وہ بھی تھے جو کسی حصہ سے بھی مکہ آئے اور امن و امان اور کاروبار دیکھ کر وہیں رہ پڑے، اور وہ بھی جو نسب اور خاندان کے اونچے لیکن زر ندارد، مفلوک الحال، قوم میں بڑی عزت اور گھر میں کھانے کی تنگی، کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن کٹ رہے تھے۔

یہ تھے اس طبقہ کے افراد، اور اسلام نے حقوق اور فرائض کے اعتبار سے ان سب کو ایک ہی درجہ دیا تھا، اگر کوئی امتیاز کی بات تھی تو وہ اسلام کی راہ میں آزمائشوں کا حصہ، مصائب اور آلام کے نزول کے وقت صبر و ثبات کی کیفیت، ضرورت کے مواقع پر نبی کی جان و مال سے امداد۔

اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس طبقے کے افراد کا امتیاز عوام میں قدرتی طور پر بڑھا عوام ان کو جن حقوق اور درجات کا حق دار خیال کرتے تھے وہ خود اپنی ذات کو ان کا مستحق تصور نہیں کرتے تھے اسی طبقہ کے افراد عام مسلمانوں کو دین سکھاتے اور جو کچھ انھیں معلوم ہوتا اس سے باخبر کرتے تھے، اور بسا اوقات جب قبائل کے لوگ نبی سے درخواست کرتے کہ ان کے پاس دین سکھانے والے بھیجے جائیں تو حضرت اسی طبقہ کے افراد کو معلم، فقیہ اور امام بنا کر بھیجتے تھے، پھر ابھی نبی کی ہجرت پر چند ہی ماہ گذرے تھے کہ معرکۂ بدر نے پوری سرزمین عرب میں اسلام کی عزت دوبالا کر دی اور اس کا رعب تمام عربوں پر چھا گیا، تھوڑے ہی دنوں بعد اس معرکے میں شریک ہونے والے بدری کہلاتے اور مسلمانوں میں ایک خاص امتیاز کے حامل ہوئے اب اگر نبی کے ساتھ کسی اور غزوہ میں شرکت کا کسی کو موقع ملا تو وہ مزید امتیاز کا مستحق ہوا اور اگر احد کے موقع پر اقلیت

کی فضا میں ثابت قدم رہنا کسی کے نصیب میں تھا تو وہ اور بھی ممتاز ہوا، اور کسی صحابی کے لئے امتیاز کا یہ آخری درجہ تھا کہ نبی اس کی تعریف کرے اسے دوسروں کے لئے امام اور رہنما کا درجہ دے اسے جنت کی بشارت سنائے اور اعلان کردے کہ وہ اس سے راضی اور خوش ہے ان تمام باتوں میں کوئی حیرت اور تعجب والی چیز نہیں اس لئے کہ یہ حالات کے تقاضے ہیں، اس سلسلے میں توجہ کے قابل بات یہ ہے کہ صحابہ کا یہ ممتاز گروہ جو باہم مختلف امتیازات اور فضائل کا حامل تھا، نبی کی وفات کے بعد مسلمانوں کے تمام معاملات کا متولی ہوا۔

اسی گروہ سے اس فرد کو پسند کیا جائے گا جو امت میں نبی کا جانشین ہوگا، اسی گروہ پر خلیفہ کو اعتماد کرنا ہوگا تاکہ لوگ اس کو مانیں اور اس کی اطاعت کریں اور یہی گروہ ہے جس کے مشورے کا ضرورت کے مواقع پر خلیفہ محتاج ہے۔

لیکن صورتِ حال یہ ہوئی کہ نبی کی وفات پر چند دن نہیں چند گھنٹے ہی گذرے تھے کہ اسلام نے خواص کی ایک نئی شکل دیکھی، جو حکومت سے شدید اتصال رکھتی ہے چنانچہ خلافت پر بحث شروع ہوئی، انصار نے قریش سے کہا ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے حضرت ابوبکرؓ نے نبی کی حدیث سنائی "خلفاء قریش میں سے ہوں" اور اس کے بعد انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہم امیر ہوں اور تم وزیر، انصاریوں نے یہ بات قبول کرلی اور کسی نے بجز سعد بن عبادہ کے کوئی اعتراض نہیں کیا، رحمۃ اللہ علیہ۔

وحی الٰہی (جدید ایڈیشن)

مسئلہ وحی پر ایک محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے دل پذیر و دل کش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ کے لائق کتاب ہے۔ کاغذ نہایت اعلیٰ۔ کتابت نفیس، طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰ قیمت ۲؎، مجلد للعہ؎